ڈاکٹر عبدالخالق
صدر شعبۂ فلسفہ

خودی اور تعمیرِ معاشرہ

فرد اور معاشرے کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ افراد کے بغیر معاشرے کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ بہرحال انہی پر مشتمل ہے۔ وہ خوبیاں جو فرد کی خودی کو استحکام عطا کرتی ہیں، معاشرے کو بھی مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ضروری ہیں اور خودی کو مضمحل کرنے والے عناصر ملّت کے شیرازے کو بھی بکھیر کر روبہ زوال کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک فرد کو جو حقوق حاصل ہیں، اور جو فرائض اس کے منصب سے وابستہ ہیں، ان کی ادائیگی معاشرے کے بغیر ناممکن ہے بلکہ دوسرے افراد کے سامنے جواب دہی کا احساس فرد کو خود اپنی تکمیل کے مختلف مراحل طے کرنے کے لیے تحریک مہیا کرتا ہے۔ اس بات کا تعیّن کرنے کے لیے کہ ایک شخص کی خودی استحکام کے کس مرحلے میں ہے ، ۔ دوسروں کا نقطۂ نظر بہت اہمیت رکھتا ہے۔

جاوید نامہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

زندۂ یا مُردۂ یا جاں بلب   از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہد اوّل شعور خویشتن !   خویش را دیدن بنور خویشتن
شاہد ثانی شعور دیگرے   خویش را دیدن بنور دیگرے
شاہد ثالث شعور ذاتِ حق   خویش را دیدن بنور ذاتِ حق

یعنی خودی کی تکمیل کا پہلا معیار میری اپنی ذات ہے اور وہ یوں کہ میں اپنے اعمال کو اعلیٰ مقاصد سے کس حد تک ہم آہنگ کر سکا ہوں۔ اس کا دوسرا معیار میرا معاشرہ ہے۔ معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس کی ذمہ داری قبول کرنے

کے لیے میں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ معاشرتی زندگی سے متعلق مختلف واقعات کی جانب جو میرا مثبت یا منفی رجحان ہے وہ مجھے ان واقعات کا ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔ تیسرا اور اعلیٰ ترین معیار شعورِ ذاتِ حق ہے۔ اپنی ذات اور معاشرے کے علاوہ خود خدائے بزرگ و برتر کے حضور میرے اندر جوابدہی کا بھرپور احساس ہونا چاہیئے۔ اگر یہ احساس پوری قوت کے ساتھ موجود ہو تو خودی میں ع

ترعین ذات می نگری و تبسّمی

کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ معاشرہ فرد کی نفسیاتی ضرورت بھی ہے۔ اسی بنا پر انسان کو SOCIAL ANIMAL کا نام دیا گیا ہے۔ فطرت انسانی میں جن جبلی خواہشات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک اجتماع پسندی کی خواہش ہے چنانچہ معاشرے سے علیحدہ ہو کر زندگی بسر کرنے کا امکان سراسر خلافِ فطرت ہے

خودی کا موجودہ تصوّر بہت حد تک علامہ اقبال کا مرہونِ منت ہے۔ علامہ سے پہلے مسلمانوں میں اور بالخصوص بعض مسلمان صوفیاء کے ہاں کچھ اس نوعیت کا فلسفہ رائج تھا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنی ہستی کو مٹا دینا چاہیئے کہ بیج خاک میں مل کر ہی خوبصورت پھول کا روپ اختیار کر سکتا ہے۔ علامہ نے نہایت زوردار انداز میں اثباتِ ذات کا نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے تکبر، نخوت اور خود پسندی کے بجائے خودداری، عزتِ نفس، استکمالِ ذات وغیرہ کے الفاظ کو خودی کا مترادف قرار دیا اور اسے شرف و کمال کی انتہائی منزلوں تک پہنچا دیا ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال سے پہلے اور خود ان کے اپنے دور میں بھی ان کے تصورِ خودی سے ملتے جلتے نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً مشہور جرمن فلسفی نٹشے نے اپنے فکر میں شعورِ ذات کی اہمیت پر اصرار کرتے ہوئے اسے معروضی حقائق کے مشاہدے کی بنیاد قرار دیا تھا۔ اس کے نزدیک خود شعوری ہی وہ عمل ہے جو مادی کائنات کی

جبریت اور انسان کی آزادیٔ ارادہ کے مابین ہم آہنگی اور توازن پیدا کرتا ہے۔ شعور سے ہستی اخذ کی جا سکتی ہے مگر ہستی سے شعور اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ اقبال کے ہم عصر مغربی مفکرین میں ممتاز اور سربرآوردہ ماہر نفسیات ولیم میکڈوگل کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے اپنی کتاب AN INTRODUCTION TO SOCIAL PSYCHOLOGY میں خودی کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے نزدیک خودی کی آفرینش اصلاً چند ایک فطری تقاضوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ INSTINCTS یا جبلتوں کا نام دیتا ہے۔ ان جبلتوں کی تسکین بقائے ذات اور افزائشِ نسل کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ابتدا میں ان جبلتوں کے مابین نظم و ضبط نہیں ہوتا۔ اگر انہیں کسی انداز سے منظم نہ کیا جا سکے تو زندگی نچلے درجے کے حیوانات کی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ انسانی درجے پر زندہ رہنے کے لیے جبلتوں کی تنظیم و ترتیب ناگزیر ہے۔ اس ترتیب کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب جبلتیں مختلف اشیاء، افراد یا واقعات کے گرد جمع ہونے لگتی ہیں اور اس طرح جذبات SENTIMENTS معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً کچھ جبلتیں والدین سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ کچھ مذہب سے، کچھ ملک و ملت سے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس سطح پر بدنظمی پورے طور پر ختم نہیں ہوتی کیونکہ ایک جبلت کئی جذبات سے متعلق ہو سکتی ہے۔ اور یوں ایک جذبے کے تقاضے دوسرے جذبے کے تقاضوں سے متصادم ہو سکتے ہیں۔ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے کچھ جذبات مقتدر حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اور باقی ان کے تحت آ جاتے ہیں۔ ایک شخص کی زندگی میں مقتدر جذبات کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن اگر وہ بہت کم بھی ہوں تو ان کے مابین تناقض کا امکان باقی رہتا ہے۔ اس امکان کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایک جذبہ مقتدرِ اعلیٰ کا کردار ادا کر سکے تاکہ اس کے مقابلے میں باقی سب جذبات کی حیثیت ثانوی ہو۔ میکڈوگل کے نزدیک ہر مکمل انسان میں ایسا جذبہ موجود ہوتا ہے اور یہ ہے جذبہ احترامِ نفس SENTIMENT OF SELF-REGARD یہی جذبہ اقبال کے تصورِ خودی کی اساس ہے۔ تاہم میکڈوگل کا نقطہ نظر سراسر نفسیاتی ہے۔ اس کے تصورِ خودی میں ہمیں ان مذہبی اور اخلاقی اقدار کا سراغ نہیں ملتا جن پر اقبال نے

بہت زیادہ زور دیا۔ اقبال نے جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی اور خودی کی تکمیل کا پیمانہ یہ مقرر کیا ہے کہ وہ کس حد تک ان اقدار کا اکتساب کر سکی ہے۔ اللہ کی ذات مطلق اور انتہائی مستحکم اور حیّ و قیوّم ہے۔ انسان کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنی خودی کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور پائیدار کرنے کا عمل جاری رکھے۔

مغرب کے ان مدرسہ ہائے فکر میں جنہوں نے فرد کی اہمیت اور فرد معتبر کے علائم و رموز واضح کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے وجودیت کا نام سرفہرست ہے۔ اس ضمن میں وجودی مفکرین نے بعض معاصر فکری رویوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ان میں سے ایک رویہ ہیگل کا فلسفہ وجود مطلق تھا۔ جس میں آفاقی شعور، کائناتی عقل اور بالعموم نظام آفرینی پر تواصرار تھا جس سے بظاہر ہر امر واقعہ کی توجیہہ بھی مہیا ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں فرد کی انفرادیت اور اس کی کما حقہٗ اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ مشہور وجودی مفکر کرکیگار کے نزدیک آفاقی شعور کی سلطنت میں منفرد اور متشخص وجود قائم رکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا یورپ کے ایک چھوٹے سے نقشے کی مدد اور ہدایت سے ڈنمارک میں سفر کرنا جبکہ اس نقشے میں ڈنمارک کا طول و عرض ایک نقطے سے زیادہ نہ ہو۔ اسی طرح مختلف وجودی مفکرین نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں پائے جانے والے متشدّد رویّے پر تنقید کی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ سائنسی فکر میں معروضیت پر جس پیرائے میں اصرار کیا جا رہا ہے اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر زندگی کے ہر شعبے میں مشینوں کی جس طرح فرمانروائی تسلیم کی جا رہی ہے اس نے فرد کی موضوعیت اور داخلی حیثیت کو ختم کر دیا ہے۔ فرد کے سارے وظیفے آہستہ آہستہ مشینوں کو منتقل کیے جا رہے ہیں اور اس میں ایک شدید قسم کی محرومی اور مغائرت کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ اگرچہ علمِ نفسیات نے فرد کے داخلی پہلو کو موضوع بحث بنایا لیکن عقلیت محض کے طریق کار اور تجزیاتی انداز فکر کی وجہ سے اس کے نتائج اور فیصلے انسان کی کلیت کو محفوظ نہ رکھ سکے اور اسے اپنے بارے میں مزید شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا۔ کائنات کے مرکزی وجود اور عملِ تخلیق کے شاہکار کی حیثیت سے انسان کے مقام و مرتبے کو بحال کرنے کے لیے وجودی مفکرین نے بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے اس کی آزادیٔ ارادہ اور بے پناہ احساس ذمہ داری

پر خصوصیت سے زور دیا۔ ان کے نزدیک عملِ انتخاب کی صلاحیت ہی کی بدولت اسے اپنی انفرادیت کا مکمل شعور حاصل ہوتا ہے۔ سارتر کا مشہور مقولہ ہے "MAN IS CONDEMNED TO BE FREE"۔ بعض مفکرین کو شکایت ہے کہ اخلاقی زندگی میں آزادئ ارادہ کے ساتھ ساتھ جو ایک اعلیٰ ترین اخلاقی نصب العین کا تصور بھی موجود ہوتا ہے وہ وجودی مفکرین کے ہاں نہیں ملتا۔ اس تصور کے بغیر آزادی اور ذمہ داری کی بات بے معنی نہ سہی نامکمل ضرور ہے۔ البتہ ایک پہلو سے وجودیت پر یہ تنقید صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ خودی کے اعلیٰ ترین مراحل میں ایک شخص تخلیقی کردار ادا کرتے ہوئے اپنے مقاصد کا خود تعین کرتا ہے۔ مروّجہ اخلاقی قواعد وضوابط کی پابندی اس کے اندر گھٹن کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اور بلند تر اخلاقی اور روحانی درجات حاصل کرنے میں اس کے لیے رکاوٹ بن جاتی ہے۔ وجودیوں کے ہاں انسان کی داخلیت پر جو اصرار پایا جاتا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہوں نے ترک علائق اور رہبانیت کا سبق دیا ہے۔ خود شعوری تو ایک صحت مند سماجی نقطۂ نظر کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ موضوعیت / داخلیت کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس کی مدد سے ایک بالاتر، غیر جانبدار اور بے لاگ رویّہ اپنایا جا سکتا ہے جو رائج الوقت تہذیب وثقافت کو صحیح تناظر میں دیکھنے کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ثقافت کے اس شعور کو اصلاح و تعمیرِ معاشرہ کی اصل قرار دینا چاہیئے۔

قرآن حکیم میں نفس انسانی کے جو تین ارتقائی مدارج بیان کیے گئے ہیں انہیں اس بحث سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ پہلا مرحلہ نفس امارہ کا ہے۔ نفس جو جسم اور روح کے دو مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے، ابتدا میں صرف جسم کی نشوونما پر توجہ دیتا ہے۔ وہ جسمانی احتیاجات وخواہشات میں منہمک رہتا ہے۔ اگر بدنی لذّت اس کا منتہا ومقصود بن جائیں اور اگر ان جذبات سے ترفع کرنے کا جذبہ اس کے اندر مفقود ہو جائے تو وہ برائی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نفس کی اسی حالت کے متعلق ارشاد ہے: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔ دوسرا مرحلہ نفس لوّامہ کا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں نفس روح کے نشوونما کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہے۔ نفس کا ایک پہلو جسم کا ساتھ دیتا ہے اور اسے برائی کی ترغیب دیتا ہے اور دوسرا پہلو روح کا ساتھ

دیتا ہے اور اسے برائی سے روکتا ہے۔ اگر یہ کشمکش مثبت انداز میں آگے بڑھے تو بالآخر روح جسم کو اپنے تابع کر لیتی ہے اور نفس وہی کچھ کرتا ہے جو روح چاہتی ہے۔ یہ نفس مطمئنہ کی منزل ہے جہاں اس کی اپنے IDEAL سے مکمل ہم آہنگی ہو جاتی ہے خودی اور خود شناسی کی یہی وہ منزل ہے جہاں ایک شخص اصلاحِ معاشرہ کا کام صحیح خطوط پر سرانجام دے سکتا ہے۔ مکمل اطمینانِ قلب حاصل کرنے سے اس میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو ایک عظیم ریفارمر میں ہونی چاہئیں مثلاً صداقت۔ جرأت و بے باکی، قول و فعل میں مطابقت وغیرہ۔ ایسے انسان کی صحبت ہی بسا اوقات دوسرے افراد میں اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

تاہم اس درجہ پر فائز شخص سے اکتساب فیض کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا جائے اور اس کے ساتھ COMMITMENT کا جذبہ ہمارے اندر موجود ہو۔ قرآن حکیم آنحضرتؐ کے لیے اسی قسم کا رویہ اپنانے پر زور دیتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

"نہیں، اے محمدؐ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر تسلیم خم کر لیں۔" (سورۃ النساء آیہ ۶۵)

اسلامی تصوف میں فنا فی الشیخ اور فنا فی الرسول کے جو تصورات پائے جاتے ہیں۔ ان کا ہمارے ہاں بدقسمتی سے بہت غلط استعمال کیا گیا ہے اور تصوف کی صحیح صورت کو مسخ کرنے میں ان کا خاصا عمل دخل ہے۔ اصولی طور پر ایک روحانی پیشوا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایات حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تعرض اور تشکیک کے رجحان کو معطل رکھا جائے۔ ہر معاملے میں سوالات اٹھانے کی عادت ایک تو فرد کی اپنی داخلی بے اطمینانی کی نشاندہی کرتی ہے اور دوسرے ممکن ہے اس سے فکر کی نت نئی راہیں تو کشادہ ہوتی ہوں لیکن یقین اور ایمان کی

دولت میسّر نہیں آتی۔

سائنسی علوم کی ترویج و ترقی کو کسی بھی جدید معاشرے کی ثقافت کا لازمی حصّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان علوم کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ ان میں فقط معروضیت پائی جاتی ہے اور ان کا سائنسدان کی داخلی کیفیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک شخص کا مذہب، اس کے نظریات و عقائد، جذبات و احساسات کچھ بھی ہوں اسے حقائق کا بہرحال ویسا ہی مشاہدہ کرنا ہوتا ہے جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں۔ لیکن اس بات کو ہر اعتبار سے صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ہم انسان دوستی اور دیگر اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار سے بہرہ ور ہوں گے تو سائنس اور ٹیکنالوجی سے مثبت نتائج اخذ کر سکیں گے۔ بصورت دیگر سائنسی علم اور فنی و تکنیکی مہارت سے جو بے پناہ طاقت حاصل ہوتی ہے اسے تخریبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسلام ہمیں انہی اقدار کا شعور دیتا ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں فطرت کے مظاہر اور اس میں کارفرما قوانین کے مشاہدے اور مطالعے کی ترغیب دی ہے وہاں اس حقیقت پر بھی اصرار کیا ہے کہ ان مظاہر میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے تجربی علوم کے ساتھ ساتھ اخلاق اللہ کا اکتساب بھی فرض منصبی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اب چونکہ انسان کو اللہ کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے اور اس کے اندر اسی کی روح جاری و ساری ہے۔ اللہ کی عادات کا تخلق انسان کی خود اپنی IDEAL NATURE کی شناخت کے مترادف ہے۔ اس لحاظ سے اخلاقی زندگی کا منتہا و مقصود اور سائنسی تجربیت کا ناگزیر معاون خودی ہی کی CONSUMMATION اور تکمیل ہے۔

> قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔